تفہیم القرآن

(۱۰)

النساء

(از رکوع ۱۹ تا ختم سورہ)

لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں[1]، کہو اللہ تمھیں ان کے معاملہ میں فتویٰ دیتا ہے[2] اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں[3]، یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے[4] اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو)[5]، اور وہ احکام جو اُن بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔[6] اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ

---

[1] اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملہ میں لوگ کیا پوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

[2] یہ اصل استفتاء کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو سورہ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص، اور یتیم بچوں کے متعلق بالعموم ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دو رکوعوں میں ان کے حقوق کے تحفظ کی شدت کے ساتھ تاکید کی جا چکی تھی، مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا، اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطور خود چھیڑ دیا گیا۔

[3] اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ....." (سورہ نساء، رکوع ۱)

[4] تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم اُن سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم اُن سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے"۔ حضرت عائشہ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے (باقی اگلے صفحہ پر)

کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

[1] جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کرلیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے [2]۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہوجاتے ہیں [3]، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو [4] یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا

(بقیہ صفحہ سابق) فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اُس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سرِدھرا پیدا نہ ہوجائے جو کل اس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔

۵۵ اشارہ ہے ان احکام کی طرف جو اسی سورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں یتیموں کے حقوق کے متعلق ارشاد ہوئے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یہاں سے اصل استفتاء کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہوگئیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کردی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلقِ زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبت رکھے؟ جسمانی تعلق میں بھی یکسانی برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہوسکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہوچکی ہے وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہوکر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کرلے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا؟ یہی وہ سوال ہیں جن کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

[2] یعنی طلاق وجدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مصالحت کرکے ایک عورت اسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصہ گذار چکی ہے۔

[3] عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جاسکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ جو عورت دل سے اُتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حقوق ناقابل برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

[4] یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبۂ فیاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو بہرحال اس کی (باقی اگلے صفحہ پر)

بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے، لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو۔[1] اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[2] لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا، اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ

(بقیہ سابق) رفیقِ زندگی رہ چکی ہے اور اُس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب اپنی نظرِ التفات اس سے پھیر لے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اُتر آئے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوبصورت ہے اور دوسری بدصورت، ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بد مزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبت و رغبت اور جسمانی تعلق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مساوات رکھی جائے، بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں معلق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ "تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے" تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ "لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو"، اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

[2] یعنی اگر حتی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملہ میں صادر ہوں گی انہیں اللہ معاف فرما دے گا۔

ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے، اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص محض ثوابِ دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دنیا بھی ہے اور ثوابِ آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے[۱]۔ ع۱۹

[۱] بالعموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے اُن پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے چند پُر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہلِ ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں۔

ایک یہ کہ تم کبھی اس بھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ کھینچ لو گے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمہاری اور اس کی، سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالکِ زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمہیں اور تمہاری طرح پچھلے تمام انبیاء کی امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمہاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی امتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمہاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سربلند کر دے گا اور تمہارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمہارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر ریجھتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا یہی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمہاری کھیتی کو ابد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہ تمہارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلہ کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصہ میں آئیں۔

آخر میں جو یہ فرمایا کہ اللہ سمیع و بصیر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! انصاف کے علمبردار[1] اور خدا واسطے کے گواہ بنو[2] اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، بہرحال اللہ دونوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو، لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ[3] اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا[4] وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔ رہے

(بقیہ سابق) شاہ بے خبر کی طرح اندھا دھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں بھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پوری باخبری کے ساتھ اپنی اس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے، ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے، ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اُن بخششوں کی امید نہیں کر سکتے جو صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم ہو۔

[2] یعنی تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے مدنظر نہ ہو۔

[3] ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ ایمان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اسے سچے دل سے مانے، پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے، اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویّے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جہد کے مصرف کو بالکل اُس عقیدے کے مطابق بنالے جسے ماننے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ پس اس آیت میں خطاب اُن تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں اور مطالبہ ان سے یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

[4] کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے؎، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔ اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت؎ کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو؎۔ یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمھارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، اگر فتح تمھاری ہوئی تو آکر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلہ بھاری

(بقیہ سابق) آدمی زبان سے مانے اور دل سے نہ مانے، یا اپنے رویّے سے ثابت کر دے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنی مراد ہیں اور آیت کا مقصود دونوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اسلام کے ان اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی ان دونوں اقسام میں سے جس قسم کا رویّہ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دوری اور باطل کی راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے، ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھی، مسلمان ہو گئے اور جب دوسری لہر اُٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب معبودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ "پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے اور اپنی قوت اس سعی و جہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلہ میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی، اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

؎ "عزت" کا مفہوم عربی زبان میں اُردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنی میں آتا ہے مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس پر دست درازی نہ کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ "عزت" "ناقابلِ ہتکِ حرمت" کا ہم معنی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟[۱۷۱] بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور اس فیصلہ میں اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ع

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کسمساتے ہوئے اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔[۱۷۲] کفر و ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں۔ نہ پورے اِس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے

(بقیہ سابق) [۱۷۰] یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی اُن صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہوئے سنتا ہے تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۷۱] ہر زمانہ کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں اُن کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۂ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر یہ کفار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقہ سے ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی "متعصب مسلمان" نہیں ہیں، نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری وفاداریاں تمہارے ساتھ ہیں، فکری اور تہذیبی اور ہر طرح کی موافقت تمہارے ساتھ ہے اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمہارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔

[۱۷۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اس زمانہ میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانہ میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جا سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہل ایمان سے ممیز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھیرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اُٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آ نہیں رہا ہے بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہو، اگلے صفحہ پر)

بھٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔[۱۵۵]

اسے ایمان لانے والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دیدو؟ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں،[۱۵۶] ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ

(بقیہ سابق) رہائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۵۵] یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسول کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہ راست دکھانا در حقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ ہدایت کا معاملہ رزق کی طرح ہے۔ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے اور اللہ ہر شخص کو اسی راستہ سے رزق دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہے، جو شخص رزق حلال کا طالب ہو اور اس کے لیے کوشش کرے اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے اسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے، اور جو شخص حرام خوری پر تلا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے اس کو حرام ہی کی روٹی ملتی ہے اور اس کے نصیب میں رزق حلال لکھ دینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا، البتہ یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہبری کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں، اس کا انحصار سراسر اس آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچائی کا طالب ہے، اور خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا

(باقی اگلے صفحہ پر)

تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو[۱] اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے[۲] اور سب کے حال سے واقف ہے۔

بدگوئی پر زبان کھولنا اللہ کو پسند نہیں، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے[۳]۔

(بقیہ سابق) اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

[۱] اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر چکے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اُسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] شکر کے اصل معنی اعترافِ نعمت یا احسانمندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ خواہ مخواہ تمھیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلہ میں صحیح احسانمندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسانمندی کا ثبوت دے۔ انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے۔ اور اس شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اولاً آدمی احسان کو اسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصہ دار نہ بنائے۔ ثانیاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو اور اس کے مخالفوں سے محبت و خلاص اور وفاداری کا ذرہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرماں بردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال نہ کرے۔

[۲] اصل میں لفظ "شاکر" استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "قدر دان" کیا ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنی "اعترافِ خدمت" یا "قدردانی" کے ہوں گے اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے معنی میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ناقدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجا لائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکّے کافر ہیں[1] اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے[2]۔ اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے[3]۔ ع ۲۱

(بقیہ سابق) کسی کی خدمات صلہ و انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

سلہ اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بت پرست سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے، لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس طرح خدا حلیم اور بردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے، بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے، اسی طرح تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوں کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوں کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔

سلہ یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد الٰہ و رب تسلیم کرلیں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں کی پیروی قبول کریں صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ اہلِ کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر اُن پر نازل کراؤ[1] تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ اُس سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک اِن پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔[2] پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا، حالانکہ یہ کھلی کُھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔[3] اس پر بھی ہم نے اِن سے درگذر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور اِن لوگوں پر طور کو اُٹھا کر اِن سے (اُس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔[4] ہم نے اِن کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔[5] ہم نے اِن سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر اِن سے پختہ عہد لیا۔[6] آخر کار اِن کی عہد شکنی کی وجہ سے

(بقیہ سابق) خدا کی لاشریک الٰہیت و ربوبیت ہی تسلیم نہ کی، یا انھوں نے خدا کے نمائندوں میں سے بعض کو قبول اور بعض کو رد کرنے کا باغیانہ طرز عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

لہ یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے ان کا حساب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں برتے گا بلکہ ان کے ساتھ بہت زیادہ نرمی اور درگذر سے کام لے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] مدینہ کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمد ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔

[2] یہاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔

[3] اس کا ذکر سورہ بقرہ رکوع ۶ میں گذر چکا ہے۔

[4] کھلی کھلی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہو کر مصر پہنچنے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مشاہدے میں آ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ رب العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے محسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مورت ہی کے آگے جھکی۔

[5] صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورۂ اعراف رکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہِ طور کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں؎ ــــ حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے اُن پر ٹھپہ لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ــــ پھر اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا؎ اور خود کہا کہ ہم نے مسیح،

(بقیہ سابق) دامن میں بنی اسرائیل کے نمائندوں سے لیا گیا تھا۔ سورۂ بقرہ رکوع ۸ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف رکوع ۲۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

؎ بقرہ رکوع ۶۔

؎ بقرہ رکوع ۸۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎ یہودیوں کے اس قول کی طرف سورۂ بقرہ رکوع ۱۱ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جہلاء کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم اُن سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آکر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے اُن کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ، ہم تمہاری کسی بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔

؎ یہ جملۂ معترضہ ہے۔

؎ یہ فقرہ اصل سلسلۂ تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔

؎ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب ایک شریف ترین مشہور و معروف مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آ گئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمھیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ۔ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے" (سورہ مریم رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادتِ مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سنِ شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریم پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب حضرت موصوف نبوت کے منصب پر مامور ہوئے اور آپ نے یہودیوں

(باقی اگلے صفحہ پر)

عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے[سلہ] ـــــ حالانکہ[سلہ] فی الواقع اِنھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا[سلہ] بلکہ معاملہ اِن کے لیے مشتبہ کر دیا گیا[سلہ]۔ اور جن لوگوں نے اُس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے[سلہ]۔ یقیناً انھوں نے مسیح کو قتل نہیں

(بقیہ سابق) ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اُس پرخطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اُتر آئے، اور اس وقت انھوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولد الزنا ہیں، حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہ کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انھوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کو اپنی دانست میں قتل کر ڈالا اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اوپر ہم نے گہوارے کے واقعہ کا جو حوالہ دیا ہے اُس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرتِ موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورۂ آل عمران رکوع ۵ میں گذر چکا ہے) ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا کہ آں جناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

سلہ یہ پورا جملہ معترضہ ہے۔

سلہ یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے اُٹھائے گئے تھے نہ کہ اس کے بعد۔ غالباً پیلاطس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سنا چکا، اور جب یہودیوں نے مسیح جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مہر لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذاتِ مقدس

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا [۱۹۶] اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے

(بقیہ سابق) نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے۔

۱۹۴ یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طور پر مشتبہ کیا گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے اس لیے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس شبہ کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسیٰ ابن مریم کو صلیب دی ہے درآں حالے کہ عیسیٰ ابن مریم ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

۱۹۵ اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں اور عیسائیوں میں بھی مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ قول نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر اُن کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اُٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر الوہیت کی رُوح جو ان میں تھی وہ اٹھالی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اُٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۹۶ یہ اس معاملہ کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اٹھا لینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ اُن کو جسم و روح کے ساتھ کرۂ زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اُٹھائی گئی۔ اس لیے نہ تو قطعی طور پر ان میں سے کسی ایک پہلو کی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے انداز بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اٹھائے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ بھی ہو بہر حال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ سابق)

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور اُن اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ الوہیت مسیح کا قائل ہوا ہے، لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ وہی رفع (Ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتاب مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السلام کا اُٹھایا جانا ویسا ہی اُٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اُٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہو سکتے تھے کہ "یقیناً انھوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچا لیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا۔"

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورہ میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے اللہ نے اُٹھا لیا تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ "اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے"۔ یہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّيكَ کا لفظ استعمال کیا ہے (رکوع ۶)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ قبضِ روح اور قبضِ روح و جسم دونوں پر دلالت کر سکتا ہے، لہٰذا یہ اُن قرائن کو ساقط کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیح کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے، سوال کرتے ہیں کہ توفی کا لفظ قبضِ روح و جسم دونوں پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب کہ قبضِ روح و جسم کا واقعہ تمام نوع انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنی پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پوچھنا محض ایک بے معنی بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اصل لغت میں اس استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفع جسمانی کے عقیدہ کی تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے اُن قرائن میں ایک اور قرینہ کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدہ کو اُلٹی مدد ملتی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر وفات کے محتمل المعنیین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفع جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد (یعنی الوہیتِ مسیح) کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا[1] اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے گا[2]

غرض[3] ان یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے

سے روکتے ہیں[4]، اور سود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا[5]، اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں،

(بقیہ سابق) پس قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت اگر کوئی طرزِ عمل رکھتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ رفع جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے اور موت کی تصریح سے بھی، بلکہ مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ایک غیر معمولی ظہور سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت کو اسی طرح مجمل چھوڑ دیا جائے جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے مجمل چھوڑ دیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) سلہ اس فقرے کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنی وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں، دوسرے یہ کہ "اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آئے"۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیح کی طبعی موت جب واقع ہوگی اس وقت جتنے اہل کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر (یعنی ان کی رسالت پر) ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیح کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے اور وہ مسیح پر ایمان لے آتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہوسکتا۔ دونوں معنی متعدد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

سلہ یعنی جو کچھ ان اہل کتاب نے مسیح علیہ السلام اور اس پیغام کے ساتھ کیا جو آپ لائے تھے، اس پر خداوند تعالیٰ کی عدالت میں آپ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

سلہ جملۂ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر اصل سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جو اوپر سے چلا آرہا ہے۔

سلہ یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہِ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلہ میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درآں حالیکہ یہ کم بخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ ان نام نہاد اہل کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کھلم کھلا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا اس کے موجد، مخترع اور بانی و سربراہ کار یہ موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں

25

ہم نے وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں[۱]، اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۲]۔ مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایماندار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی[۳]۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے اور اللہ اور روز آخرت پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور

(بقیہ سابق) شہ توراۃ میں بالفاظ صریح یہ حکم موجود ہے کہ :-

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا کیونکہ فقط وہی اس کا ایک اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے، پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا۔ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اس کی سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں" (خروج باب ۲۲: ۲۵-۲۷)

لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی پاک چیزیں استعمال کرنے کا جو حق ان کو دیا گیا تھا وہ ان کی اس مسلسل بغاوت کی وجہ سے واپس لے لیا گیا، اللہ سے بغاوت کر کے اب جو کچھ وہ اس کی زمین میں کھا رہے ہیں حرام کھا رہے ہیں، جن ذرائع سے استفادہ کر رہے ہیں بلا کسی حق کے کر رہے ہیں، اب وہ اللہ کی نگاہ میں خارج از حد قانون (outlaw) ہیں۔

سلہ یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم رہیں ان کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عبرتناک سزا ان کو ملی اور مل رہی ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں، دنیا میں تتر بتر کر دیے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں، کوئی دور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطہ میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہوں اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی، اس کو دنیا میں لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ کی سزا دی گئی ہے تاکہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگذشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلہ میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ رہی آخرت تو ان شاء اللہ وہاں کا عذاب اس سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ رکوع ۲

اے محمد! ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔[۱] ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی۔[۲] ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ہم نے اُن رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔[۳] یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے[۴]، صرف اس لیے کہ ان پیغمبروں کو مبعوث کر دینے کے بعد

(بقیہ سابق) بھی زیادہ دردناک ہوگا۔

[۱] یعنی ان میں سے جو لوگ کتب آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اُس امرِ حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے ان کی روش کا فرد ظالم یہودیوں کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاء نے دی تھی اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل ان کو بھی اسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

[۲] وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

[۳] دوسرے انبیاء علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آ رہی ہے یا فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سن رہے ہیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورہ طٰہٰ میں نقل کی گئی ہے۔

[۴] یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رویہ کو اس کے مطابق درست کر لیں انھیں فلاح و سعادت کی خوشخبری سنا دیں اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں اُن کو اس غلط روی کے بُرے انجام سے آگاہ کر دیں۔

لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے[1] اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ (یہ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے، اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور خدا کے راستہ میں مانع و مزاحم بنتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے انکار و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے، ایمان لے آؤ، تمہارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[2] اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔[3]

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو[4] اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ

---

[1] یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کر دے اور آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم خدا کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ آپ نے ہمیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام کیا ہی نہ تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہ راست معلوم تھی اور انھوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا مگر انھیں آگاہ نہ کیا۔

[2] یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔ نقصان جو کچھ ہوگا تمہارا اپنا ہوگا۔

[3] یعنی تمہارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو، اور نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

[4] یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غلو کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا[1] جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے[2] (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی)۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ[3] اور نہ کہو کہ تین ہیں[4]۔ باز آجاؤ، تمھاری بہتری اسی میں ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی الٰہ ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی

(بقیہ سابق) گذر جانے کے۔ جس طرح یہودیوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کا انکار کیا اور اس میں حد سے گذر گئے اسی طرح عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے مسیح کو ماننا اور ماننے میں حد سے گذر گئے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] اصل میں لفظ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کرلے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا، مگر انھوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا، پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفت مراد لے لی جو ہمیشہ سے اس کی ذاتی صفت ہے، پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسدی صورت اختیار کی تھی جو عبارت ہے ذاتِ مسیح سے۔ اس طرح ان کے اندر مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

[2] یہاں خود مسیح کو رُوْحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے، اور سورہ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی)۔ دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا، سراسر حقانیت اور راستبازی، اور از سرتاپا فضیلت اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی، مگر انھوں نے اس میں بھی غلو کیا، روح من اللہ کو عین روح اللہ قرار دے لیا، روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی روح مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی، اور اس طرح انھوں نے اللہ اور مسیح کے علاوہ روح القدس کو تیسرا الٰہ بنا ڈالا۔ یہ ان کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

[3] یعنی اللہ کو واحد الٰہ مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو جن میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک سچے پیرو مسیح کو ماننا چاہیے۔

[4] یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں تمھارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا بیٹا ہو[1]۔ زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں[2] اور ان کی کفالت وخبر گیری کے لیے بس وہی کافی

(بقیہ سابق) توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتداء میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلمۃ اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے مسیح اور روح القدس کی الوہیت کو بھی خداوند عالم کی الوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابل حل چیستاں بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں، بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں، اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے، اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں، اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیح اور روح القدس کی الوہیت کا تخیل چھوڑ دیں اور صرف اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ عیسائیوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ بائیبل کے عہد جدید کی روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، چنانچہ جس طرح انھوں نے اپنے لیے خدا کو باپ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح عام انسانوں کے لیے بھی کیا ہے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب وغریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی روح کا جسدی ظہور ہے اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسان کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسانوں کے گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متأثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ ہے اور اس سوال کی ایک صوفیانہ توفلسفیانہ توجیہ ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ع

ہے۔[1]

مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنھوں نے ایمان لا کر نیک طرزِ عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو وہ دردناک سزا دے گا اور خدا کے سوا جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیلِ روشن آگئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔

لوگ تم سے کلالہ[3] کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد

(بقیہ سابق) جب مسیح خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔

[1] یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلق ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [2] یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

[3] یہ آیت اس سورہ کے نزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت سنہ ۹ ہجری میں نازل ہوئی۔ اور سورۂ نساء اس سے بہت پہلے ایک مکمل سورہ کی حیثیت سے پڑھی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو ان آیات کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

مرجائے اور اس کی ایک بہن ہو[۵۳] تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اسی طرح بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔[۵۴] اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی[۵۵] اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) سلسلہ میں شامل نہیں کیا گیا جو احکام میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے سورہ کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

۵۲ کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو لاولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لاولد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخر وقت تک اس معاملہ میں متردد رہے۔ لیکن عامۂ فقہاء نے حضرت ابوبکر کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہاں کلالہ کی بہن کو نصف ترکہ کا وارث قرار دیا گیا ہے؛ حالانکہ اگر کلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۳ یہاں ان بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے جو میت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبہ میں اس معنی کی تشریح کی تھی اور صحابہ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مجمع علیہ مسئلہ ہے۔

۵۴ یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحب فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

۵۵ یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔